درس ۵

سُورۃ الفاتحۃ

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

نَحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ○ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ○ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ○ ﴾ (آمین)

اللہ تعالیٰ کے نام سے ہم آج کی صحبت میں اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے' جو ہماری نمازوں کا جزو لازم ہے اور جس کو خود اللہ تعالیٰ نے "القرآن العظیم" سے موسوم فرمایا ہے۔ دین سے ادنیٰ شغف رکھنے والے ہر شخص کو بھی یہ سورۂ مبارکہ لازماً یاد ہوتی ہے۔ تاہم مناسب ہو گا کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مطالب پر غور کرنے سے قبل اس کا سلیس اردو ترجمہ ذہن نشین کر لیں :

> "کل شکر اور کل ثناء اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ بہت رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔ (اے رب!) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے' اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش۔ ان لوگوں کی راہ کی جن پر تیرا انعام ہوا' جن پر نہ تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے۔" (آمین!)

چند تمہیدی اور بنیادی باتیں

سب سے پہلے مجھے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چند تمہیدی باتیں عرض کرنی ہیں اور اس کے مضامین کا اجمالی تجزیہ پیش کرنا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ قارئین کرام ان کو گن کر اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں اور انہیں ہمیشہ مستحضر رکھیں۔

سب سے پہلے نازل ہونے والی مکمل سورۃ

پہلی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورۃ ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اس سے قبل متفرق آیات نازل ہوئیں۔ مثلاً وہ پانچ آیات جو سورۃ العلق کے ابتداء میں شامل ہیں۔ اور اس پر تقریباً اجماع ہے کہ وہ سب سے پہلی وحی ہے۔ اکثر محققین کے نزدیک دوسری وحی وہ سات آیات ہیں جو سورۂ "ن" (جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے) کے آغاز میں شامل ہیں۔ پھر تیسری وحی سورۃ المزّمّل کی ابتدائی سات آیات ہیں اور چوتھی وحی سورۃ المدّثر کی ابتدائی سات ہی آیات ہیں' جبکہ پانچویں وحی جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی وہ یہ سورۂ فاتحہ ہے جو پہلی مکمل سورت ہے۔ پھر حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ سورۂ مبارکہ بھی سات ہی آیات پر مشتمل ہے۔

سورۃ الفاتحہ کی عظمت

دوسری بات اس سورۂ مبارکہ کی عظمت کے بارے میں ہے۔ اس ضمن میں ایک تو خود اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے۔ چنانچہ چودھویں پارے میں سورۃ الحجر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝﴾

"(اے نبیؐ!) بے شک ہم نے آپؐ کو عطا فرمائی ہیں سات دہرائی جانے والیاں (یعنی وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ نماز کی ہر رکعت میں ان کا اعادہ ہوتا ہے) اور قرآن عظیم (عطا فرمایا)۔"

اس آیت کے بارے میں مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ "سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی" سے مراد بھی سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور "القرآن العظیم" بھی اسی سورۂ مبارکہ کو قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس سورۂ مبارکہ کی عظمت یہ ہے کہ یہ بجائے خود ایک مکمل قرآن ہے' اور نہ صرف قرآن بلکہ "قرآنِ عظیم" ہے۔ سورۃ الحجر کا وہ مقام جس میں یہ آیۂ مبارکہ وارد ہوئی ہے وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو صبر کی تلقین فرمارہے ہیں اور ساتھ ہی اپنا یہ احسان اور فضل بھی بیان فرمارہے ہیں کہ اے نبی ہم نے آپ کو اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے جتنی بڑی نعمت کسی اور کو نہیں دی' اور وہ ہے سورۂ فاتحہ۔

اس سورۂ مبارکہ کی عظمت ایک حدیث رسولؐ سے مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت ابی بن کعبؓ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اَقْرَءُهُمْ اُبَیُّ بْنُ کَعْب" یعنی "صحابہؓ میں قرآن کے سب سے بڑے قاری (عالم) اُبَیّ ابن کعب ہیں"۔ ان سے ایک بار خود نبی اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ "اے اُبَیّ! کیا میں تمہیں وہ سورت تلقین کروں جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن مجید میں!" جواب میں حضرت ابی ابن کعبؓ نے سراپا اشتیاق بن کر عرض کیا : "حضورؐ ضرور فرمائیے"۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے دوسرا سوال کیا : "تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟" حضرت اُبَیؓ نے جواب میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت شروع کر دی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "یہی ہے وہ سورت جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی مثل و نظیر موجود ہے اور یہی "سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی" اور قرآن عظیم ہے!"

سورۃ الفاتحہ کے عظیم نام

تیسری بات اس سورۂ مبارکہ کے ناموں سے متعلق ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور زبان زد خاص و عام نام "الفاتحہ" ہے جو "ف ت ح" مادہ سے بنا ہے۔ "فَتَحَ - یَفْتَحُ" کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ لہٰذا "الفاتحہ" کے معنی ہوئے "قرآن مجید کی افتتاحی سورت"۔ یہ نام گویا اس اعتبار سے ہے کہ یہ مصحف کی پہلی سورۃ

ہے۔ سب جانتے ہیں کہ عربوں کا یہ خاص مزاج ہے کہ جس چیز سے انہیں خصوصی محبت ہوتی ہے وہ اس کے نام کثرت سے رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کے بھی بے شمار نام ملیں گے۔ اس کی عظمت کے اعتبار سے اسے "اُمّ القرآن" اور "اساس القرآن" بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کے لئے جڑ' بنیاد اور اساس کے مرتبے اور مقام کی حامل سورۃ ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن حکیم کی ایک اپنی حکمت اور اس کا ایک اپنا جداگانہ فلسفہ ہے۔ چنانچہ حکمتِ قرآنی کے لُبِّ لباب' اس کے جوہر' اس کے خلاصے اور قرآن حکیم کے طرز استدلال کے اعتبار سے بھی اس سورۂ مبارکہ کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو "الکافیہ" کا نام بھی دیا گیا ہے یعنی یہ انسان کی فکری رہنمائی کے لئے کفایت کرنے والی سورت ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو "الشافیہ" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے یعنی اس میں شفاء ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید کو بھی "شفاء" قرار دیا ہے' چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۵۷ میں فرمایا گیا :

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○﴾

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے' اور شفاء بھی دلوں کے امراض کے لئے اور رہنمائی اور رحمت ان کے لئے جو اس پر ایمان لے آئیں۔"

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۲ میں فرمایا گیا :

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○﴾

"اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے۔"

یہاں جس شفاء کا تذکرہ ہے اس کے متعلق یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے ذہنی و فکری شفاء اور دل کے روگ جیسے حسد' کینہ' بغض' تکبر وغیرہ باطنی امراض مراد ہیں۔ گویا انسان کی سوچ کو درست کرنے والی کتاب' کتابِ الٰہی ہے اور باطن کے امراض کا مداوا بھی

قرآن حکیم ہے۔ اس موقع پر ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ انسان کے جسم اور ذہن میں بہت گہرا ربط ہے۔ ذہن و فکر مریض ہوں تو جسم پر بھی اس کے آثار ظاہر ہوں گے۔ قارئین کے علم میں ہو گا کہ آج کل کے دور میں امراض ذہنی و نفسیاتی کا بڑا چرچا ہے۔ یہ دراصل فسادِ فکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر فکر صحیح ہو گی' سوچ درست ہو گی تو لازماً انسان کو جسمانی تندرستی بھی حاصل ہو گی۔ ان اعتبارات سے پورا قرآن مجید بھی شفاء ہے اور یہ سورۂ مبارکہ بھی' کیونکہ یہ پورے قرآن کے خلاصے کی حامل سورت ہے۔ اس میں مومنوں کے لئے ہدایت کے ساتھ ذہنی' فکری اور قلبی شفاء بھی موجود ہے۔ مزید برآں یہ کلام اللہ ہے' اس پر کامل و اکمل یقین رکھنے والوں کے لئے اس میں جسمانی طور پر شفاء ہونا بھی مستبعد نہیں۔ سورۂ فاتحہ کے جسمانی شفاء ہونے کا احادیث صحیحہ میں ذکر ملتا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کا اسلوب اور انداز

چوتھی بات اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب سے متعلق ہے۔ اگرچہ یہ کلامِ الٰہی ہے لیکن اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ گویا بندوں کو تلقین کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا چاہو تو اس طور سے ہو۔ مزید گہرائی میں اتر کر غور کریں تو درحقیقت انسان کی فطرت سلیمہ کی ترجمانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے جامع الفاظ کی شکل میں فرمائی ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ ترانہ شکر و سپاس اور حمد و ثناء بھی ہے' اس میں اللہ کی ربوبیتِ کاملہ اور اس کے مالکِ ارض و سماء ہونے کا اقرار بھی ہے' اس کے رحمٰن اور رحیم ہونے کا یقین بھی ہے اور اس کے جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار کل' نیز اس کے عادل و منصف اور قادر مطلق ہونے کا ایقان بھی ہے۔ پھر اس میں صرف اسی کی بندگی و پرستش اور صرف اسی سے مدد و اعانت طلب کرنے کا قول و قرار اور عہد و میثاق بھی ہے۔ مزید برآں اس میں اسی سے صراط مستقیم پر گامزن کرنے اور منزل تک پہنچانے کی توفیق طلبی بھی ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی راہ پر چلانے کی دعا بھی ہے جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ' بلکہ ان کا شمار اللہ تبارک و تعالیٰ کے محبوب اور انعام یافتہ بندوں میں ہوا۔

گویا اس سورۂ مبارکہ کو اس طرح قرآن مجید کے لئے ایک دیباچہ بنا دیا گیا اور بقیہ

پورے قرآن مجید سے اس کا تعلق یہ ہوا کہ یہ تو ہے انسان کی فطرتِ سلیمہ کی پکار' اور اس کا جواب وہ ہے جو قرآن آگے پیش کر رہا ہے۔ انسان کی فطرت میں جس ہدایت اور سیدھے راستے کی طلب ہے وہ "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کی دعا کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس طلب اور دعائے ہدایت کا جواب ہے یہ پورا قرآن' جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کا آغاز ان الفاظ مبارکہ سے ہوتا ہے کہ:
﴿الٓمّٓ ○ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ○﴾ "الم" یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں' یہ خدا ترس لوگوں کے لئے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے" اس طرح ایک طرف یہ سورۂ مبارکہ فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے فطرتِ انسانی کی ترجمانی پر مشتمل ہے اور دوسری طرف قرآن مجید کے ساتھ اس کا ربط و تعلق تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب کے مقدمے یا دیباچے کا اصل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

نماز کا جزوِ لازم

پانچویں بات بہت اہم ہے۔ یقیناً یہ بات تمام قارئین کرام کے علم میں ہوگی کہ یہ سورۂ مبارکہ ہماری نماز کا جزوِ لاینفک ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی مشہور حدیث ہے' جو متفق علیہ ہے' یعنی جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ "لَا صَلَاۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ" یعنی "اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی"۔ ایک اور حدیثِ قدسی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور امام مسلم اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ حدیث طویل ہے جس پر ان شاء اللہ آگے گفتگو ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ اصل نماز سورۂ فاتحہ ہی ہے۔ اس معاملے میں کسی بھی فقہی مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لازم ہے۔

البتہ اس معاملے میں جو اختلاف ہے اسے چھٹی بات کے طور پر نوٹ کر لیجئے۔ یہ بات بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ہمارے یہاں بعض بڑے جلیل القدر ائمہ دین اور فقہائے کرامؒ کے مابین بعض مسائل میں کچھ اختلافات قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں'

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں اسے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں! ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورۃ تو ہر شکل میں پڑھنی ہے' جہری رکعات میں بھی پڑھنی ہے اور سِرّی رکعات میں بھی۔ دوسری رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ یہ کہ جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو امام سورۂ فاتحہ پڑھے لیکن مقتدی قطعاً نہ پڑھیں' نہ جہری رکعات میں نہ سِری رکعات میں۔ امام ہی کی قراءت مقتدیوں کی طرف سے سورۂ فاتحہ کی قراءت شمار ہو جائے گی۔ جیسے ایک وفد کسی دربار میں حاضر ہوتا ہے تو اس وفد کا قائد یا ترجمان جو بات کرتا ہے وہ سب کی طرف سے شمار ہوتی ہے۔ ایک بین بین کی رائے بھی ہے' وہ یہ ہے کہ اگر جہری رکعت ہے تو امام بلند آواز سے سورۂ فاتحہ کی قراءت کرے گا اور مقتدی سنیں گے اور اگر سِری رکعت ہے تو امام بھی خاموشی سے قراءت کرے گا اور مقتدی بھی اس کے پیچھے خاموشی سے پڑھیں گے۔ ان آراء کے حاملین کے اپنے اپنے مسلک اور موقف کے لئے نہایت مضبوط اور مبسوط دلائل موجود ہیں۔

اس ضمن میں قارئین کرام کے سامنے جو بات اہمیت اور تاکید کے ساتھ لانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات کے ضمن میں ہمیں اپنے سینوں کو کشادہ رکھنا چاہئے۔ یہ اختلاف خلوص پر مبنی ہے۔ سب صحیح بات تک پہنچنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سب کے پاس اپنے اپنے موقف کے دلائل موجود ہیں۔ یہ فروعی اختلافات ہیں۔ دین کی اصل روح سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ہر رائے افضل و مفضول اور راجح و مرجوح کے اصول پر مبنی ہوتی ہے اور ہر رائے میں خطائے اجتہادی کا یکساں احتمال ہوتا ہے' جس کے متعلق اہلسنت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مبنی بر خلوص اجتہاد میں خطا پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب عطا ہو گا اور اگر اجتہاد صحیح ہو تب تو اس پر دہرا اجر ملے گا۔ البتہ اس مسئلے کے ضمن میں خصوصی بات یہ ہے کہ اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے۔ جب مسلمان انفرادی طور پر نماز پڑھ رہا ہو تو اسے لازماً ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ہو گی۔ البتہ جب جماعت میں شامل ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ امام کی سورۂ فاتحہ کی قراءت تمام مقتدیوں کی طرف سے بھی کفایت کرے گی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ مقتدی کو بھی ہر رکعت میں امام کے پیچھے یہ سورہ پڑھنی ہوگی اور ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں خاموش رہے گا' البتہ سری رکعت میں خود بھی سورۂ فاتحہ پڑھے گا۔

تعدادِ آیات

ساتویں بات اس سورۂ مبارکہ کی آیات سے متعلق ہے۔ یہ چیز متفق علیہ ہے کہ اس سورۃ کی آیات کی تعداد سات ہے۔ جیسا کہ میں نے سورۃ الحجر کی آیت کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ تمام مسالک کے نزدیک "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِی" کی مصداق یہ سورۂ مبارکہ ہے۔ لہٰذا آیات کی تعداد سات ہونے میں کوئی اختلاف ممکن نہیں۔ البتہ اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض علمائے کرام "بسم اللہ" کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں' جبکہ اکثر علماء "بسم اللہ" کو سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک وہ بالکل علیحدہ ایک مستقل افتتاحی آیت ہے جو سورۂ براءۃ (سورۂ توبہ) کے علاوہ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی جاتی ہے' لیکن اس سورۃ کا جزو نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں کہ علماء اور قراء کے مابین خلوص سے بھی اختلاف رائے ہوتا ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگرچہ وزنی رائے وہی معلوم ہوتی ہے جو امام ابوحنیفہؒ کی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں "بسم اللہ" شامل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس رائے کی پشت پر وہ حدیثِ قدسی ہے جس کا قدرے تفصیل سے ذکر آگے آئے گا۔

تین حصّوں پر مشتمل سورۃ

آٹھویں بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے تین حصے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ آیات سات ہیں لیکن نحوی اعتبار اور گرامر کے اصولوں کے لحاظ سے ان سات آیات سے مکمل جملے تین ہی بنتے ہیں۔ پہلی تین آیات "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝" گرامر کی رو سے ایک ہی جملہ ہے اور نحوی اعتبار سے یہ "جملہ اسمیہ خبریہ" ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکرو سپاس ہے' اس کی صفاتِ رحمانی و رحیمی اور عدل و قسط کا بیان ہے۔ پھر چوتھی

آیت جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے خود ایک مکمل جملہ ہے' بلکہ اس کے مزید تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک آیت میں دو مکمل جملے موجود ہیں۔ بہرحال یہ ہے "جملہ فعلیہ خبریہ" ــــ یہ مرکزی آیت ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" ترجمہ ہے "(اے رب ہمارے!) ہم صرف تیری ہی بندگی و پرستش کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے"۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے اور عربی میں چونکہ فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہوتے ہیں' لہٰذا ان امور کا ترجمہ میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس آیت میں رب اور بندے کے مابین ایک قول و قرار اور ایک معاہدہ و میثاق ہے۔ یہ مسلّمہ بات ہے کہ معاہدے میں دو فریق منسلک ہوتے ہیں' لہٰذا یہ "جملہ فعلیہ خبریہ" درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان عہد و پیمان ہے۔ تیسرا حصہ جو آخری تین آیات پر مشتمل ہے : "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ' غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝" یعنی "(اے رب ہمارے!) ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش۔ ان لوگوں کی راہ کہ جن پر تونے انعام فرمایا' جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ"۔ یہ بھی ایک ہی جملہ بنتا ہے اور نحو کے اعتبار سے یہ "جملہ انشائیہ" ہے۔ یہ ایک دعا ہے۔ اس میں ایک بندہ اپنے رب سے جس کی وہ تحمید و تمجید کرچکا' جس کی ربوبیت' رحمانیت' رحیمیت اور عدالت کا اقرار کرچکا' پھر جس سے وہ عبادت و استقامت کا عہد بھی استوار کرچکا' اب وہ اسی رب سے اپنی فطرت کی پکار اور پیاس کی سیرابی کے لئے "صراطِ مستقیم" یعنی زندگی بسر کرنے کے لئے معتدل و متوازن طرز زندگی اور راہ عمل کی رہنمائی اور توفیق کا طلب گار اور مستدعی ہے۔

اس موقع پر نویں اور آخری بات سے قبل وہ حدیثِ قدسی ترجمہ کے ساتھ پیش کرنی مناسب ہے جس کا ذکر پہلے دوبار ہوچکا ہے اور جو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي

نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ (الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ) قَالَ اللَّهُ تَعَالَى حَمِدَنِي عَبْدِي وَإِذَا قَالَ (الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ) قَالَ اللَّهُ تَعَالَى أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي وَإِذَا قَالَ (مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ) قَالَ مَجَّدَنِي عَبْدِي وَقَالَ مَرَّةً فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي فَإِذَا قَالَ (إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) قَالَ هَذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ فَإِذَا قَالَ (اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ) قَالَ هَذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لئے اور نصف حصہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء کی۔ جب بندہ کہتا ہے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی۔"

گویا یہ پہلا حصہ کل کا کل اللہ کے لئے ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل قارئین اس مقام پر یہ بات نوٹ فرمالیں کہ اس حدیث قدسی میں "قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِىْ وَبَيْنَ عَبْدِىْ نِصْفَيْنِ" کے بعد آیت "بسم اللہ" کا ذکر موجود نہیں بلکہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے براہ راست بات آگے بڑھتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آیت بسم اللہ سورۂ فاتحہ میں شامل نہیں ہے۔ اب حدیث کی طرف رجوع فرمائیے :

"جب بندہ کہتا ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اس نے مانگا۔"

گویا یہ حصہ ایک معاہدہ ہے' قول و قرار ہے' عہد و میثاق ہے۔ اس میں بندے نے "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ" کہہ کر اللہ کی عبادت کا عہد کیا ہے اور "وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" میں کچھ طلب بھی کیا ہے' مدد بھی چاہی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے اپنے بندے کو دیا جو اس نے مجھ سے طلب کیا۔" اب آخری حصہ رہ گیا۔ فرمایا :

> "جب بندہ کہتا ہے اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ...... وَلَا الضَّآلِّیۡنَ تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کا کُل) میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اسے بخشا۔"

اس حدیث کی رو سے سورۂ فاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے۔ پہلا حصہ کلیتاً اللہ کے لئے ہے اور آخری کلیتاً بندے کے لئے جبکہ درمیانی و مرکزی آیت "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" بندے اور اللہ کے مابین قول و قرار ہے۔ گویا اس کا بھی نصفِ اول اللہ کے لئے اور نصفِ ثانی بندے کے لئے۔ اس طرح نصف نصف کی تقسیم بہ تمام و کمال پوری ہو گئی!

"آمین" کی حیثیت

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں نویں اور آخری بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر "آمین" کہنا مسنون ہے۔ آمین کے معنی ہیں "اے اللہ ایسا ہی ہو۔" یہ ابتدا ہی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب دعائیہ ہے' لہٰذا دعا کے اختتام پر "آمین" کہہ کر گویا بندہ پھر بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ "اے پروردگار! میں نے یہ استدعا اور یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے' تو اسے شرفِ قبول عطا فرما۔ اے پروردگار ایسا ہی ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد تمام فقہی مسالک میں آمین کہنے کے مسنون ہونے پر اتفاق ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ امام کے پیچھے جہری رکعت میں آمین اونچی آواز سے کہی جائے یا پست آواز سے تو ان سب آراء رکھنے والوں کے پاس

دلائل موجود ہیں۔ یہ بھی ایک فروعی اختلاف ہے۔ اب میں جو متفقہ بات ہے وہ ہماری رہنمائی کے لئے کفایت کرتی ہے کہ سب کے نزدیک سورۂ فاتحہ کی قراءت کے بعد "آمین" کہنا مسنون ہے۔

ہم نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں جو چند تمہیدی و بنیادی باتیں سمجھی ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہماری نمازوں میں جان' خشوع و خضوع اور حضوری قلب پیدا ہو جانے کا ذریعہ بنا دے۔ اور جب ہم اپنی نمازوں میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کریں تو اس کے مفہوم کو سمجھ کر ذہنی اور قلبی وابستگی کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں۔ اور دل کی گہرائیوں سے اس بات کے آرزومند ہوں کہ اس سورت کے ذریعے جس صراطِ مستقیم کی استدعا کی جاتی ہے' وہ ہمیں بالفعل حاصل ہو جائے اور ہمیں اس پر چلنے کی توفیق کی بھی بارگاہ ربانی سے ارزانی ہو ــــ آمین!

سورۃ الفاتحہ کا جزو اول

سورۂ فاتحہ کے سلیس و رواں ترجمے' اس کے بارے میں چند تمہیدی باتوں اور اس کے مضامین کے اجمالی تجزیئے کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کے تینوں حصوں کو علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جیسے کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے اس سورۂ مبارکہ کا جزو اول تین آیات پر مشتمل ہے :

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

"کل شکر اور کل ثنا اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے۔ بہت رحم فرمانے والا' نہایت مہربان' جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

نوٹ کیجئے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی افتتاحی سورۃ ہے اور اس کا ابتدائی کلمہ

ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ۔ یہ کلمہ طیبہ نہایت عظیم اور بہت بلند مرتبت ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے لفظ "حمد" کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ صرف ایک لفظ "تعریف" سے کر دیا جاتا ہے' حالانکہ تعریف بھی عربی کا لفظ ہے اور حمد بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی زبان کے دو الفاظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے' ان کے معنی و مفہوم میں لازماً کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو لفظ "حمد" میں دو مفہوم شامل ہیں' ایک شکر اور دوسرا ثناء۔ شکر کا لفظ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں تفصیلاً زیر بحث آ چکا ہے۔ وہاں واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر فطرت اپنی صحت پر برقرار ہو تو اس کا تقاضا جذبۂ تشکر ہے اور اگر عقل صحیح نہج پر کام کر رہی ہو تو اس کا حاصل اپنے منعمِ حقیقی اور اپنے اصل مربی و محسن یعنی اللہ کو پہچان لینا ہے۔ فطرت سلیمہ اور عقل صحیحہ دونوں کے امتزاج سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کا نام "حکمت" ہے۔ لہٰذا حکمت کا لازمی تقاضا اللہ کا شکر ہے۔ یہی بات اس سورۂ مبارکہ کے ابتدائی کلمات میں آئی ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" لیکن حمد کا لفظ شکر سے زیادہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ کسی کا شکر ایسی چیز پر ادا کیا جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ شکر کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو۔ لیکن ثنا اور تعریف کی جاتی ہے کسی بھی حسن و جمال یا کمال کی خواہ اس کا ہمیں کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ حمد کے لفظ میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں' یعنی شکر بھی اور ثناء بھی۔ لہٰذا ہم نے ترجمہ میں ان دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ "کُل شکر اور کُل ثناء اللہ کے لئے ہے۔"

ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے تو آپ اس نتیجے سے اتفاق کریں گے کہ یہ کلمۂ توحید ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی مظہرِ حسن ہے' مظہرِ کمال ہے' مظہرِ جمال ہے ان کے متعلق ہماری عقل صحیحہ یہ رہنمائی کرتی ہے کہ ان تمام محاسن و کمالات کا منبع اور سرچشمہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ لہٰذا اصل تعریف اور ثناء ان اشیاء کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ہوتی ہے۔ کلمہ توحید کا اقتضاء یہی ہے کہ موحّد کے شعور اور تحت الشعور سب میں یہ بات مستحضر رہے کہ کائنات کی ہر نعمت' ہر چیز' ہر حسن' ہر جمال اور ہر کمال الغرض کوئی وصف کسی کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا ودیعت کردہ ہے۔

جیسے تصویر میں اگر کوئی حسن ہے تو وہ در حقیقت مصور کے کمالِ فن کی عکاسی ہے۔ تصویر کا اپنا کوئی حسن نہیں' نہ اس کا کوئی اپنا ذاتی کمال ہے۔ بالکل اسی طرح کسی مخلوق میں اگر کوئی حسن اور کمال ہے یا کوئی خوبی اور جمال ہے تو وہ حسن و کمال اور خوبی و جمال خالق کا ہے' نہ کہ مخلوق کا۔ چنانچہ اس کُل سلسلۂ کون و مکان میں جہاں کوئی حسن' کوئی کمال' کوئی خیر' کوئی خوبی اور کوئی جمال ہے یا کسی شے میں کوئی نفع رسانی کا پہلو ہے تو اس کا منبع و سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ لہٰذا شکر کا سزاوارِ حقیقی اور تعریف و ثناء کا اصل مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔

یہ کلمہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" اتنا عظیم اور اعلیٰ مرتبت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلمہ آسمان و زمین کو اپنی برکات سے بھر دیتا ہے۔ فرمان نبویؐ ہے : "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیزَانَ' وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَآنِ [أَوْ تَمْلَأُ] مَا بَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"۔ (مسلم) "کلمہ سبحان اللہ میزان کو نصف بھر دیتا ہے اور جب ایک انسان ساتھ ہی الحمد للہ کہتا ہے تو یہ کلمہ نہ صرف میزان کو پُر کر دیتا ہے بلکہ آسمان و زمین کے مابین جو خلا ہے' جو فضا ہے اس سب کو پر کر دیتا ہے"۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور احسانات کے ضمن میں انبیاء و رسل علیہم السلام اور صالحین کے جو کلماتِ شکر منقول ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ نے جن دعاؤں کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر میں یہ کلمہ "الحمد للہ" استعمال ہوا ہے۔ طوالت سے بچنے کی خاطر دو مثالیں قرآن مجید اور دو مثالیں حدیث شریف سے پیش کرنے پر اکتفا کرنی ہوگی۔ سورۂ ابراہیم میں وارد ہے کہ جب بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ جیسے صالح فرزند عطا فرمائے جو آگے چل کر منصبِ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے تو اس احسان و انعام و نعمت اور کرم پر حضرت ابراہیم کی زبان پر ترانہ شکر جاری ہوا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ۚ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ" (آیت ۳۹) یعنی "کُل شکر اور ثنا اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا فرمائے۔ یقیناً میرا رب دعا کا سننے (اور قبول کرنے) والا ہے"۔ ایک اور مثال سورۂ اعراف سے دیکھ لیجئے۔ جب مومنین صادقین کو حساب کتاب

کے بعد جنت میں داخلے کا اِذن ملے گا تو ان کی زبانوں پر کلمۂ شکر و سپاس اور تعریف و ثناان الفاظ میں جاری ہو گا کہ "وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ" (آیت ۴۳) "اور وہ کہیں گے کل شکر اور کل ثناء اس اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی (بلکہ یہاں تک پہنچا دیا) اور ہم خود ہدایت نہ پا سکتے (اور یہاں تک ہرگز نہ پہنچ پاتے) اگر اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا"۔ رسول ﷺ نے سو کر اٹھنے کی یہ دعا تلقین فرمائی کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورِ" یعنی "کل شکر و ثناء اللہ کی ہے جس نے ہمیں زندہ کیا اس کے بعد کہ ہم پر موت طاری کر دی تھی اور (ایک دن اسی طرح) اس کی جانب لوٹ جانا ہے" اور اکل و شُرب کے بعد کی دعا ان الفاظ میں تلقین فرمائی "اَلحمدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ" یعنی "کل شکر اور ثناء اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمانوں میں شامل فرمایا"۔

رَبِّ الْعَالَمِين

اب آگے باری تعالیٰ کی چند مزید صفات کمال کا ذکر ہو رہا ہے۔ پہلی بات سامنے آتی ہے۔ "رَبِّ الْعٰلَمِينَ" "جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے"۔ "رب" کے لفظ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ عرب گھر کے مالک کو ربّ البَیت یا ربّ الدّار کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں رب کا لفظ مالک کے معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورۂ قریش میں آتا ہے: "فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ" یعنی "پس عبادت کرو اس گھر (حرم شریف) کے مالک کی"۔ پھر رب کا مفہوم پرورش کرنا، ترقی اور نشوونما دینا بھی ہے۔ ایک مالک ایسا نااہل اور ناکارہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی ملکیت کو لے کر بیٹھ رہے۔ اس کی ترقی اور نشوونما کی اسے کوئی خاص پرواہ نہ ہو اور ایک مالک ایسا قابل و قادر ہوتا ہے کہ اس کی ملکیت میں جو چیزیں ہیں وہ ان میں سے ہر چیز کو اس کی استعدادات کے مطابق پروان چڑھائے اور ہر شے کو اس کے نقطہ کمال تک پہنچانے کا سامان فراہم کرے! پس اللہ کی ذات گرامی وہ ہے جو ہر شے کے نقطۂ عروج و کمال تک پہنچنے کے جملہ مقتضیات کو فراہم

کرنے اور بہم پہنچانے والی ہے۔ "عَالَمِین" عالَم کی جمع ہے۔ لہٰذا یہاں رب العالمین کا مفہوم ہوگا سارے جہانوں کی مخلوقات کا مالک اور پروردگار اللہ ہی ہے۔ آقا بھی وہی ہے اور پرورش کنندہ بھی وہی ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم

اگلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک اور وصف "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم" کے الفاظ میں بیان ہوا۔ یہ اللہ سبحانہ کے دو بڑے عظیم صفاتی نام ہیں۔ دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ اسی رحمت سے "رحمٰن" اور اسی سے "رحیم" بنا۔ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عربی زبان میں "فَعلانُ" کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس میں ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جیسے کسی شے میں جوش و خروش اور طوفانی اور ہیجانی کیفیت ہو۔ خود ہَیجان بھی فَعلان کے وزن ہی پر ہے۔ تشبیہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو' اس میں زبردست ہلچل ہو۔ کسی صفت کی یہ کیفیت ہو تو عربی میں اسے اکثر فَعلان کے وزن پر لایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کہا جائے "اَنَا عَطشَان" تو مفہوم ہوگا "میں شدید پیاسا ہوں یا پیاس سے مرا جا رہا ہوں"۔ "اَنَا جَوعَان" "میں بہت بھوکا ہوں یا بھوک سے میری جان نکل رہی ہے"۔ "ھُوَ غَضبَان" "وہ نہایت غصے اور طیش میں ہے"۔ ان امور کو سامنے رکھئے اور اب رحمٰن کے لفظ کو سمجھئے کہ اس کے معنی کیا ہوں گے! رحمٰن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے۔ جس کی رحمت میں انتہائی جوش و خروش ہے۔

البتہ "فعیل" کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس صفت میں اس کے دوام و استمرار کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ وقتی جوش و خروش نہیں ہے بلکہ اس میں پائیداری و استواری اور مستقل مزاجی ہے۔ گویا اللہ کی رحمت کی شان یہ بھی ہے کہ اس میں دوام اور استمرار ہے جیسے ایک دریا ہمواری کے ساتھ مسلسل بہہ رہا ہے' اس میں ہیجان نہیں ہے۔ سمندر کی طرح کا جوش و خروش نہیں ہے۔ لیکن بہاؤ کا ایک خاموش اور پُرسکون تسلسل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں شانیں ہیں جو اس سورۂ مبارکہ میں بیک وقت

موجود ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے' رحیم بھی ہے۔ اس بات کو ایک تشبیہ سے مزید سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ سڑک پر کوئی حادثہ ہو گیا ہو جس میں کئی افراد ہلاک ہو گئے ہیں اور فرض کیجئے کہ اس حادثے میں ایک ایسی عورت بھی ہلاک ہو گئی جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا۔ وہ بچہ زندہ ہے اور اپنی مردہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر کون انسان ہو گا جس کے دل میں رقت پیدا نہ ہو اور شفقت و رحمت کے جذبات موجزن نہ ہو جائیں۔ ہر انسان یہ چاہے گا کہ یہ بچہ جو بے سہارا ہو گیا ہے' میں اس کی کفالت اپنے ذمہ لے لوں' اس کی پرورش میں کروں۔ لیکن اگر وہ اس جوش میں یہ ذمہ داری لے بیٹھا' تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر یہ وقتی جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں ہی کے بعد اسے محسوس ہو کہ میں یہ کیا غلطی کر بیٹھا! میرے اپنے بچے ہیں' میری بے شمار ذمہ داریاں پہلے سے موجود تھیں' اب ان پر مستزاد یہ بوجھ میں نے خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا۔ گویا وقتی طور پر وہ ہیجانی کیفیت جو اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی جس کے زیر اثر اس نے بے سہارا بچے کی کفالت کی ذمہ داری لے لی تھی' اس میں دوام و استمرار نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت ہیں۔ وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے مابین حرفِ عطف "وَ" نہیں آیا بلکہ یہاں فرمایا "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" یعنی اس میں یہ دونوں صفات' یہ دونوں شانیں بیک وقت بہ تمام و کمال موجود ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ یہ سورۂ فاتحہ یعنی قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورۃ کی پہلی دو آیات ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کا جو تعارف ہمارے سامنے آتا ہے اس میں کون سی چیز غالب ہے؟ وہ ہے اس کی ذات کا لائقِ حمد و ثناء اور قابلِ شکر و امتنان ہونا اور اس کی ربوبیتِ عامہ اور اس کی رحمتِ تامہ! یہ ہے اللہ سبحانہ کا ابتدائی تعارف جو قرآن نوعِ انسانی سے کراتا ہے۔ یہاں اس اعتراض کو بھی پیشِ نظر رکھ لیجئے جو بعض مستشرقین اور ان کی تقلید میں اکثر آریہ سماجیوں نے قرآن مجید اور اسلام پر کیا ہے' پھر اس اعتراض کے صحیح

جواب کو بھی جان لیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ کے خوف پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اسی کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خوف' تقویٰ' میدان حشر کے مصائب' جہنم کے عذاب اور اس کی روح فرسا تفصیلات کی بہت تکرار رہے' جبکہ ہمارے مذہب میں اللہ کی محبت اور اس کے شفیق و رحیم ہونے پر بہت زور ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید پر بہتان ہے' اس لئے کہ قرآن مجید بالکل افتتاحی سورۃ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا جو ابتدائی تعارف کرا رہا ہے وہ معاذ اللہ ثم معاذ' اللہ کسی خوفناک ہستی کا تعارف نہیں ہے بلکہ ایک پروردگار اور پالن ہار' ایک سراپا رحمت و شفقت ذات' ایک شفیق اور رؤدود ہستی اور ایک رحمٰن و رحیم آقا کا تعارف کرا رہا ہے جو تمام صفاتِ کمال سے متّصف ہے اور جس کی ذاتِ اقدس میں تمام محاسن موجود ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس کا اصل اور حقیقی تعارف تو یہ ہے جو سورۂ فاتحہ کی ان دو آیات میں بیان ہوا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سب لوگ محبت کے رمز آشنا اور قدر شناس نہیں ہوتے' اکثر لوگ پست ذہنی سطح ہی کے حامل ہوتے ہیں' جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ایسے لوگوں کے لئے ضرورت ہے کہ انہیں خوف بھی دلایا جائے' ان کے دلوں میں بازپرس کا احساس بھی اجاگر کیا جائے' ان کو عذابِ الٰہی سے خبردار بھی کیا جائے اور برے کاموں کی سخت سزا سے ڈرایا بھی جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دونوں چیزیں یعنی اللہ تعالیٰ کے غفور' ستار' رحیم' رحمٰن' رؤف' ودود ہونے کی شانیں بھی ملیں گی اور قہار' ذوانتقام' سریع الحساب ہونے کا ذکر بھی ملے گا۔

ابتداء میں نبی اکرم ﷺ کو جو احکام ملے ہیں ان میں آپؐ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے : یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ "اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہو جاؤ (کمربستہ ہو جاؤ) اور لوگوں کو خبردار کرو"۔ ایک اور جگہ فرمایا : وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ○ "اور (اے نبی) اپنے رشتہ داروں اور قریبی اعزہ کو خبردار کیجئے"۔ تو ابتداء میں انذار کا پہلو ضرور غالب رہا لیکن اصولاً قرآن مجید

جس اللہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے وہ معاذ اللہ کوئی خوفناک ہستی نہیں بلکہ محبت کرنے والی اور محبت ہی نہیں پرستش کرنے کے لائق ہستی ہے' اس سے محبت کرو' اسے چاہو' اس سے لو لگاؤ' جیسے کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا : "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (آیت ۱۶۵) "جو واقعتاً صاحب ایمان ہیں وہ تو سب سے زیادہ شدید محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں"۔ اور اس محبت کی اساسات ہیں جو سورۂ فاتحہ کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے آئیں کہ اللہ تعالیٰ تمام محاسن و کمالات کا جامع ہے' منبع و سرچشمہ ہے' وہ کائنات کا رب ہے' مالک ہے' پروردگار ہے' پالن ہار ہے' وہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے اور استمرار اور دوام کے ساتھ بہنے والے دریا کے مانند بھی ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

تیسری آیت میں دوسرا رخ آ رہا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا' یعنی انذار۔ فرمایا : "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" زندگی محض اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ زندگی ایک امتحان گاہ ہے' جس میں آزمائش ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندگی بسر کرتا ہے' جیسے سورۂ ملک میں فرمایا : "خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" (آیت ۲) "موت اور زندگی کو اللہ نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ تم کو آزمائے اور دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ لہٰذا اس آزمائش اور امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن بھی ہو۔ اور وہ دن آ کر رہے گا جس دن لوگوں کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا' ہر انسان کا محاسبہ ہو گا اور اسے جواب دہی کرنی ہو گی۔ اس محاسبہ اور حساب کتاب کے نتیجے میں جزا یا سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یہ ہو گا "یوم الدین" جس کے متعلق ہم آیۂ بر کے درس میں پڑھ چکے ہیں' اس کے بارے میں سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا : "اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝" (آیات ۵' ۶) "جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی"۔ اس محاسبہ کے نتیجے میں یا جنت ہو گی ہمیشہ کے لئے یا آگ ہو گی دائمی' جیسا کہ نبی اکرم

ﷺ کے ابتدائی خطبات میں سے ایک خطبہ کے آخر میں آتا ہے :

وَاللّٰہِ لَتَموتُنَّ کما تنامُون ' ثُمّ لَتبعَثُنَّ کما تَستیقِظُونَ ' ثمّ لَتُحاسَبُنَّ بِما تَعمَلُونَ ' ثُمّ لَتُجزَوُنَّ بِالاِحسانِ احسانًا وَبِالسُّوءِ سُوءً ' وَانّها الجَنّۃُ اَبَدًا اَولَنارُ اَبَدًا

"اللہ کی قسم تم سب (ایک دن) مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا' پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا (اور یہ اس شکل میں ہو گا کہ) وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی"۔

اس فیصلے اور جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار صرف اللہ ہے۔ "مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ" ...... اور اس روز اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں کہ اس روز ایک ندا ہو گی : "لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ" یعنی "آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟" اور پھر جواب میں فرمایا جائے گا : "لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ" (المؤمن : ۱۶) "آج تمام اختیار اور کل بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے جو الواحد ہے' تنہا ہے' یکتا ہے اور پوری طرح سے قابو یافتہ اور مسلّط ہے' مقتدرِ اعلیٰ ہے' جو چاہے کرے"۔

یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جس کے بارے میں حدیث قدسی کے حوالے سے یہ بتایا جاچکا ہے کہ ان کلمات کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اِدھر بندہ کہتا ہے "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ" اور اگر یہ دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں تو فوراً اللہ تبارک و تعالیٰ جواب میں ارشاد فرماتا ہے : "میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا" اور جب بندہ کہتا ہے "اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" تو اللہ جواب میں فرماتا ہے : "میرے بندے نے میری ثناء کی"۔ جب بندہ کہتا ہے "مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ" تو اللہ فرماتا ہے : "میرے بندے نے میری بڑائی کا اعلان کیا اور میری عظمت بیان کی"۔

لفظ "اللہ" کی تحقیق

اس پوری بحث میں ایک دقیق لغوی و علمی مسئلے کو جان بوجھ کر نہیں چھیڑا گیا۔ اور وہ

ہے لفظ "اللہ" کی تحقیق۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند بنیادی باتیں عام فہم انداز میں بیان کی دی جائیں۔

لغوی اعتبار سے لفظ "اللہ" کے بارے میں دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اسم جامد اور اسمِ عَلَم ہے 'یعنی نہ اس کا کوئی مادہ ہے 'نہ یہ کسی اور لفظ سے بنا ہے' بلکہ یہ اسم ذات ہے اس ہستی کا جس نے اس سلسلہ کون و مکان کو تخلیق فرمایا۔ للذا اصل ضرورت اس اسم ہی کو حرزِ جاں بنانے اور دل پر کندہ کرنے کی ہے نہ کہ اس کے معنی کے کھوج کرید کی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے بقیہ تمام اسماء حسنیٰ کے مانند صفاتی نام ہے اور لفظ "الٰہ" پر لام تعریف داخل کر کے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں الٰہ حقیقی اور معبودِ برحق!

پھر خود "الٰہ" کے مادے کی تحقیق بھی ایک دقیق اور طوالت طلب معاملہ ہے 'لیکن تین مفہوموں پر تقریباً اجماع ہے۔ ایک وہ ہستی جس کی طرف حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے رجوع کیا جائے' دوسرے وہ ہستی جس کے بارے میں عقل حیران اور سرگشتہ ہو کر رہ جائے اور تیسرے وہ ہستی جس سے والہانہ محبت ہو۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ عوام الناس کی رسائی اکثر و بیشتر صرف پہلے مفہوم تک ہوتی ہے' جبکہ فلاسفہ کا تحیر و لاادریت دوسرے مفہوم کے مظہر ہیں اور صوفیاء تیسرے اور بلند ترین مفہوم سے سرشار ہوتے ہیں...... واللہ اعلم!!

جزوِ ثانی : عبادت اور استعانت

اس سورۂ مبارکہ کا جزو ثانی ایک آیت پر مشتمل ہے اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے یہ ہر اعتبار سے اس سورۃ کی مرکزی آیت ہے 'یعنی

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○﴾

یہاں پہلی بات یہ نوٹ فرمایئے کہ اس آیت میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں' ایک

"نَعْبُدُ" اور دوسرا "نَسْتَعِيْنُ" ...... یہ دونوں فعل مضارع ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ اردو کی طرح عربی و فارسی میں فعل کی تین حالتیں ماضی' حال' اور مستقبل نہیں ہوتیں' بلکہ صرف دو حالتیں ہوتی ہیں' ایک ماضی اور دوسری مضارع' اور فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں' لہٰذا "نَعْبُدُ" کا ترجمہ یہ بھی ہو گا کہ "ہم بندگی کرتے ہیں" اور یہ بھی ہو گا کہ "ہم بندگی کرتے رہیں گے"۔ اسی طرح "نَسْتَعِيْنُ" کا ترجمہ یہ بھی درست ہو گا کہ "ہم مدد مانگتے ہیں" اور یہ بھی صحیح ہو گا کہ "ہم مدد مانگیں گے"۔

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اگر یہاں "نَعْبُدُ كَ" کا لفظ ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ "ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور کریں گے" لیکن چونکہ ضمیر مفعولی "كَ" کو فعل سے پہلے لایا گیا اور اس کے لئے "اِيَّا" کا اضافہ کیا گیا' یعنی "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" تو اس میں ایک مزید تاکیدی مفہوم پیدا ہو گیا اور وہ یہ کہ "ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے"۔ اس کو قواعد کی رو سے حصر کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ "زید عالم ہے" تو اس سے ایک خاص مفہوم ذہن میں آئے گا' لیکن اگر یہ کہا جائے کہ "زید ہی عالم ہے" تو اس "ہی" کے اضافے سے مفہوم میں عظیم فرق واقع ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جب یہ کہا گیا کہ زید عالم ہے تو دوسروں کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی۔ گویا دوسرے بھی عالم ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ زید ہی عالم ہے' تو اس میں حصر پیدا ہو گیا اور اس کا مفہوم یہ ہو گیا کہ "علم" صرف زید ہی کے پاس ہے' دوسروں سے "علم" کی نفی ہو گئی۔ لہٰذا "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" میں اسی حصر کا مفہوم پیدا ہے۔ اس کا ترجمہ اور حقیقی مفہوم ہو گا : "ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے"۔ اسی طرح "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کا مفہوم ہو گا : "ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے"۔

تیسری بات یہ کہ اس آیت کا مرکزی لفظ "عبادت" ہے' جس کا ہم اقرار بھی کر رہے ہیں اور عہد بھی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" یہ اقرار ہے یا اظہارِ واقعہ ہے۔ اور "ہم تیری ہی عبادت کرتے رہیں گے" یہ ایک وعدہ' قول و قرار اور

عہد و میثاق ہے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ عبادت کا حقیقی معنی و مفہوم کیا ہے؟ بدقسمتی سے اس لفظ عبادت کے بارے میں عوام الناس کے ذہنوں میں بڑا محدود تصور پایا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ عبادت بس نماز ٗ روزہ ٗ حج اور زکوٰۃ کا نام ہے۔ چنانچہ جب بھی عبادت کا لفظ سامنے آتا ہے ذہن لامحالہ صرف ان عبادات ہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس لفظ کی اصل عظمت اور وسعت سامنے نہیں آتی۔ اس لئے جان لیجئے کہ اس لفظ عبادت کا مادہ "ع ب د" ہے اور "عبد" غلام کو کہتے ہیں۔ غلامی کا وہ تصور جو کبھی دنیا میں رائج تھا وہ سامنے ہو تب اس لفظ کی اصل حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ جو شخص کسی کا عبد یعنی غلام ہوتا تھا ٗ وہ اپنے آقا کی ملکیت ہوتا تھا۔ اس کا کام اپنے مالک کے احکام کو بجالانا ہوتا تھا۔ آقا جو حکم دیتا تھا غلام کا فرض تھا کہ وہ بسرو چشم اس کی تعمیل کرے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ غلام تو مملوک ہوتا تھا ٗ اس کا کام تو اپنے آقا کی مرضی پر چلنا تھا۔ اس کی پسند اور ناپسند اوّل تو رہنی ہی نہیں چاہئے تھی اور اگر رہتی بھی تو اس کا فرض تھا کہ اسے پس پشت ڈال دے اور اپنے آقا کی پسند و ناپسند اور مرضی و ناراضی کو مقدم رکھے۔ پس معلوم ہوا کہ لفظ عبد میں جو تصور مضمر ہے وہ مکمل اور ہمہ تن ٗ ہمہ وقت اور ہمہ جہت غلامی کا تصور ہے۔ فارسی میں اس کے لئے بہترین لفظ "بندگی" ہے ٗ چنانچہ عبد کے مفہوم کے لئے بندہ کا لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا۔

"تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے"

یعنی یہ کہ انسانوں ہی میں سے کوئی آقا بن جائے اور کوئی بندہ ٗ تو اس سے زیادہ غلط اور خلافِ انسانیت بات اور کوئی نہیں! اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اے لوگو! تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ" تم سب اللہ کے بندے ہو ٗ اس اعتبار سے برابر ہو ٗ بھائی بھائی ہو ٗ تم میں سے کوئی آقا اور غلام ہے ہی نہیں۔ حقیقی آقا اللہ ہے اور تم سب اس کے غلام ہو۔

بندگی کے اس ہمہ گیر تصور کو سامنے رکھ کر اس حقیقت کی جانب توجہ کی جائے تو پانچویں اہم بات یہ سامنے آئے گی کہ از روئے قرآن مجید غایتِ تخلیقِ جن و انس یہی

عبادتِ رب ہے۔ چنانچہ سورۃ ذاریات میں ارشاد ہوتا ہے : "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ o" یعنی "میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔ یہ ہے ہماری غایت تخلیق۔ قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اس شعر میں کی ہے جو بہت سی مسجدوں میں لکھا ہوتا ہے کہ۔

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

چھٹی قابل غور بات یہ ہے کہ کوئی شے جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد ہی کو پورا نہ کرے تو ظاہر بات ہے کہ وہ بے کار قرار پائے گی اور ہم اسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ لہٰذا جب انسان کی تخلیق ہوئی ہی بندگی کے لئے ہے تو اگر وہ بندگی کی روش کو اختیار نہ کرے یا اسے تج دے اور ترک کردے تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کا اب کم از کم انسانی سطح پر کوئی مقصد نہیں رہا۔ اور اس کی زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی ہے یا شاید اس سے بھی کم تر!

اس ضمن میں ساتویں اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ "ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے" تو یہ ایک بہت بڑا عہد ہے اور اس کے بہت سے تقاضے ہیں' جن کو سمجھے اور جانے بغیر عبادت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ (یاد رہے کہ یہ باتیں ہمارے سامنے شرک فی العبادت کی بحث کے ضمن میں پہلے بھی آ چکی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب ان کا ایک دوسرے سیاق و سباق میں اعادہ ہو رہا ہے۔)

عبادت کا سب سے پہلا تقاضا اطاعت ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو عبادت کی اساس ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ پھر بندگی کہاں ہوئی؟ مزید بر آں اطاعت اگر کُلی نہ ہو جزوی ہو تب بھی عبادت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ کسی غلام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے ایک حکم کو مانے اور ایک نہ مانے۔ غلام نے اگر آقا کے ایک حکم سے بھی سرتابی کی تو وہ مقامِ بندگی سے تجاوز کر گیا۔ لہٰذا اطاعت لازم ہے تمام احکام خداوندی کی' ہر آن اور ہر لحظہ! اور زندگی کا کوئی گوشہ بندگی سے خارج یا مستثنیٰ نہیں رہے گا۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا

گیا : "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" (البقرہ : ۲۰۸) "اے اہل ایمان! (اطاعت اور) فرمانبرداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ" گویا جزوی اطاعت مطلوب نہیں ہے کہ اللہ کی کچھ باتوں پر تو سرِ تسلیم خم ہو اور کچھ باتوں سے انحراف کیا جائے۔ اس پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت ۸۵ میں اس طرزِ عمل پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا :

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ۚ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○﴾

"کیا تم ہماری کتاب (اور ہماری شریعت) کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور کچھ حصوں کو نہیں مانتے؟ تو جو کوئی اس جرم کا ارتکاب کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہیں دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو"۔

یہ ہے جزوی اطاعت پر اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا عالم! اس لئے کہ جزوی اطاعت حقیقت کے اعتبار سے استہزاء اور تمسخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں فرمایا : "اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو" اس گمان میں نہ رہنا کہ وہ تمہارے کرتوتوں سے واقف نہیں ہے بلکہ وہ تو العلیم' البصیر' اللطیف اور الخبیر ہے۔ اس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

آٹھویں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک اطاعت ہوتی ہے زبردستی کی' جیسے ہم انگریز کے غلام تھے اور ہم اس کی اطاعت پر مجبور تھے۔ اس اطاعت پر بھی لغوی طور پر لفظ عبادت کا اطلاق ہو جائے گا اور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ چنانچہ آلِ فرعون نے بنی اسرائیل کو جس طریقے سے اپنی غلامی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا' اس کے لئے قرآن مجید میں یہی لفظ عبادت آیا ہے۔ فرعون نے بڑے طنطنے اور غرور کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے بارے میں کہا تھا : "وَقَوْمُھُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ"

(المومنون : ۴۷) "ان دونوں کی قوم ہماری عابد ہے" یعنی ہماری غلام ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر حضرت موسیٰ نے بھی فرعون سے فرمایا تھا : "..... اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ" یعنی "تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام' اپنا محکوم اور مطیع بنالیا ہے"۔ لہٰذا اس نوع کی غلامی اور محکومی پر بھی لفظاً تو عبادت کا اطلاق ہو جائے گا لیکن اصطلاحاً اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے وہ زبردستی اور مجبوری کی اطاعت نہیں بلکہ دلی آمادگی اور محبت کے ساتھ مطلوب ہے۔ اللہ کے احسانات و انعامات کا شعور و ادراک کرتے ہوئے کہ اس کے جذبۂ تشکّر سے قلب و ذہن سرشار ہو جائیں' ان احساسات و جذبات کے ساتھ جب اللہ کی بندگی ہوگی' اس کی کامل اطاعت ہوگی تب عبادت کا اصل تقاضا پورا ہوگا' جس کو ہمارے ائمہ دین نے بڑی خوبصورتی سے یوں ادا فرمایا "اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے' اس میں دو بنیادیں جمع ہونی چاہئیں" یعنی "ایک طرف اللہ کی انتہادرجہ کی محبت ہو اور دوسری طرف انتہادرجے میں اس کے سامنے تذلّل اور عاجزی اختیار کی جائے' اس کے سامنے ہمہ تن جھک جایا جائے' بچھ جایا جائے"۔ جب یہ دونوں کیفیات ـــــ محبت اور تذلّل ـــــ جمع ہو جائیں گی تو عبادتِ رب اور بندگیٔ رب کے تقاضے کی تکمیل ہوگی۔ محبتِ الٰہی عبادت کے لئے کس قدر لازمی ہے' مولانا رومؒ نے اسے اپنے زمانے میں بڑی خوبی سے ادا کیا تھا کہ ؎

شادباد اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ عِلّت ہائے ما

اور اس دور میں علامہ اقبال مرحوم نے اس کی اہمیت پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

محبتِ الٰہی عبادت کی روح ہے' اگر یہ روح نہیں ہے اور صرف خالی خولی اطاعت ہے' دل کی محبت کی چاشنی اس میں شامل نہیں ہے تو علامہ اقبال کے بقول معاملہ یہ ہوگا کہ ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام!
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

لہٰذا ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ محبت در حقیقت عبادت کی روح ہے۔

نویں بات یہ ہے کہ عبادت میں اطاعتِ کلی و محبتِ حقیقی کے ساتھ جو تیسری چیز مطلوب ہے وہ اخلاص ہے۔ اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں اقسامِ شرک کی بحث میں بھی یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ آج پھر اس کا اعادہ کر لیجئے۔ عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم اخلاص ہے' یعنی اللہ کی بندگی پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ہونی چاہئے۔ اس میں کوئی ریاکاری نہ ہو اور اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور چیز مطلوب و مقصود کے درجے میں نہ آ جائے۔ مطلوب صرف اللہ کی رضا اور اخروی فلاح و نجات ہو۔ اگر یہ اخلاص و للّٰہیت موجود نہیں ہے بلکہ کوئی ریاکاری ہے' یعنی لوگوں پر اپنی عبادت گزاری اور اپنے زہد و تقویٰ کی دھونس جمانی ہے اور اپنی نیکی کا رعب قائم کرنا ہے' یا شہرت مطلوب ہے' یا دنیا کی کوئی منفعت پیشِ نظر ہے تو یہ خلوص سے خالی عبادت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہو گی۔ بلکہ' جیسا کہ اس سے قبل واضح ہو چکا ہے' شرکِ خفی شمار ہو گی۔ جیسے "اقسامِ شرک" کی بحث میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث بیان ہو چکی ہے کہ "جس نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لئے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا"۔ اس حدیث سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دین میں خلوص و اخلاص کی کس قدر اہمیت ہے اور ریا کی کتنی مذمت ہے کہ اس کے ڈانڈے شرک سے مل جاتے ہیں۔

اب آخری اور دسویں بات پر غور کیجئے کہ پوری زندگی میں پورے خلوص و اخلاص' شدید ترین قلبی محبت اور کامل اطاعت کے ساتھ عبادت کا حق ادا کرنا' واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے' بہت مشکل کام ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کا اپنا نفس ہی آڑے آتا ہے۔ مولانا رومؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ۔

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن او را عون ایں را عون نیست

فرعون کے پاس حکومت تھی' لاؤ لشکر تھا۔ اس لئے اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ میرا نفس بھی اگرچہ فرعون سے کمتر نہیں ہے البتہ اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے' اس

لئے وہ خدائی کا زبانی دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اندر سے وہ کہتا یہی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ کا حکم کیا ہے! میری مرضی چلے گی---- خود غور کیجئے کہ اذان کی آواز کان میں آگئی ہے گویا اللہ کا حکم ہے کہ نماز کے لئے آؤ۔ ادھر نفس کہہ رہا ہے کہ ابھی مزید سوتے رہو' مزید آرام کرو' یا جس دلچسپی میں مصروف ہو اسے جاری رکھو۔ اب فیصلہ کن بات یہ ہوگی کہ ہم نے کس کا حکم مانا! اگر نفس کی خواہش کو کچلتے ہوئے ہم نے اللہ کا حکم مانا اور نماز کے لئے نکل کھڑے ہوئے تو واقعی ہم بندۂ رب ہیں۔ اگر نفس کی خواہش پر عمل کیا اور اللہ کے حکم کو پسِ پشت ڈال دیا تو ہم بندۂ نفس ہو گئے---- یہی بات سورۂ فرقان میں فرمائی گئی :

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ' اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝
(الفرقان : ۴۳)

"(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو معبود بنالیا' تو کیا آپ ایسے شخص کا ذمہ لے سکتے ہیں!"

اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

یعنی "میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے' اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ پر پورا اترنا کتنا مشکل ہے!"

یہ ہے ربط و تعلق کہ جب بندہ کہے : "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" تو اس پر ایک لرزہ طاری ہو جائے' اسے پورا احساس اور کامل شعور ہو کہ وہ کتنا بڑا قول و قرار کر رہا ہے۔ اس کیفیت میں اسے پناہ گاہ نظر آئے گی "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کے الفاظ مبارکہ میں---- کہ اے اللہ میں یہ وعدہ اور عہد تو کر رہا ہوں اور میں نے ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ پوری زندگی تیری عبادت میں بسر کروں گا لیکن میں محض اپنی قوت اور طاقت کے بل پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور اس عہد پر پورا نہیں اتر سکتا جب تک کہ تیری مدد شاملِ حال نہ ہو۔ میں اس عہد کے پورا کرنے میں تیری اعانت اور تائید و توفیق کا محتاج ہوں۔ تیری اعانت اور مدد شامل ہوئی تب ہی میں اس قول و قرار اور عہد و پیمان کو پورا کر

سکوں گا۔ یہ تو ہے اصل ربط و تعلق "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے ساتھ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا' اضافی طور پر اس میں اخلاص فی الدعاء کا مضمون بھی آگیا۔ اس لئے کہ یہاں بھی حصر کا اسلوب ہے۔ گویا ہر نوع کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے اللہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے' اسی سے اعانت طلب کی جائے' اسی کے جناب میں استغاثہ پیش کیا جائے۔ یہ توحید فی الدعاء ہے' جس کا ذکر اس سے قبل اقسام شرک کی بحث کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

اسی آخری بات کے ضمیمے کے طور پر یہ بھی نوٹ فرمالیجئے کہ ہر فرض نماز کے بعد جو اذکار نبی اکرم ﷺ کے معمول میں شامل تھے' ان میں یہ دعا بھی منقول ہے: "رَبِّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ" یعنی "اے پروردگار میری مدد فرما تاکہ میں تجھے یاد رکھ سکوں' تیرا شکر ادا کر سکوں اور تیری عبادت کا باحسنِ وجوہ حق ادا کر سکوں"۔

جزوِ ثالث : درخواستِ ہدایت

سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصہ اگرچہ تین آیات پر مشتمل ہے تاہم ان سے جملہ ایک ہی بنتا ہے۔ آیئے کہ پہلے ان تین آیاتِ مبارکہ اور ان کے ترجمے پر ایک نظر ڈال لیں:

﴿ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ○ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○ ﴾ (آمِین یارَبَّ العَالَمِین!)

"(اے رب ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ"۔

(اے تمام جہانوں کے مالک! ایسا ہی ہو)

پہلی تین آیات پر تدبر سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ایمان باللہ یا توحید اور ایمان بالآخرۃ یا معاد تک ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان فطرت و عقل کی رہنمائی

میں از خود بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے باطن میں ایک بے پناہ جذبۂ تشکر پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھی آیت سے معلوم ہوا کہ اسی جذبۂ تشکر سے جذبۂ عبادت ابھرتا ہے۔ اس سے آگے واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی خود اپنی محدودیت اور نارسائی کا اعتراف کرتی ہے کہ جہاں تک صراطِ مستقیم یعنی زندگی بسر کرنے کے معتدل و متوازن طریقے کا تعلق ہے' وہاں انسانی عقل بے بس اور محتاج ہدایت ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ مقام جہاں بندہ سراپا احتیاج بن کر ایک استدعا اور ایک درخواست اپنے مالک کے حضور پیش کرتا ہے کہ اے رب ہماری رہنمائی فرما یعنی ہمیں دکھا اور چلا اس راستہ پر جس میں کوئی کجی نہ ہو' کوئی ٹیڑھ نہ ہو' افراط و تفریط کے دھکے نہ ہوں' جو ہمیں سیدھا تیری رضا تک پہنچانے والا' اور آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے والا ہو۔

"ہدایت" عربی زبان کا ایک نہایت وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ راستہ دکھایا جائے' بتادیا جائے' سمجھادیا جائے' یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس راستے پر ذہن اور قلب کو مطمئن کر دیا جائے اور یہ بھی شامل ہے کہ انگلی پکڑ کر اس راستے پر چلایا جائے اور بالآخر و بالفعل منزلِ مراد تک پہنچا دیا جائے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں۔ سورۂ محمد (ﷺ) میں فرمایا : "وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ○" (آیت ۱۷) "وہ لوگ جو ہدایت کے راستہ پر آئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور انہیں ان کے حصہ کا تقویٰ عطا فرمادیا"۔ اسی طرح سورۂ مریم میں فرمایا : "وَیَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا هُدًی" (آیت ۷۶) "اور اللہ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت اور راست روی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔" یہ ہدایت مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام مدارج و مراحل مومنین صادقین کو طے کرا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مراد تک جا پہنچتے ہیں اور جنت میں داخلے کے وقت ان کی زبانوں پر یہ ترانۂ حمد جاری ہو جاتا ہے :

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ"۔ "سارا شکر و سپاس اور کل تعریف و ثناء اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں راستہ دکھایا اور ہمیں یہاں تک پہنچا دیا اور ہم خود ہرگز راہ یاب نہ ہو سکتے اگر اللہ ہی

رہنمائی نہ فرماتا"۔ واضح رہے کہ یہی عقلی بنیاد ہے ایمان بالرسالت کی' کیونکہ ہدایتِ الٰہی رسولوں ہی کے واسطے سے بنی نوع انسان تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف کی اس آیت کے آخر میں کامیاب وبامراد مومنین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے : "لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ " یعنی "ہمارے رب کے رسول واقعی حق لیکر ہی تشریف لائے تھے"۔

یہاں یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ شخص جو بنیادی حقائق تک خود پہنچ چکا ہے' جس نے اللہ کو پہچان لیا' اس کی توحید کو جان لیا' اس کی صفاتِ کمال کی معرفت حاصل کرلی' اس کی ربوبیت' رحمانیت و رحیمیت کا ادراک و شعور حاصل کرلیا' اس کے مالکِ یوم الدین ہونے کا اقرار کرلیا' پھر اس کی بندگی اور پرستش کا عہد و پیمان کرلیا تو اسے تو گویا کل ہدایت حاصل ہو گئی۔ اب اسے کون سی مزید ہدایت مطلوب ہے جس کے لئے وہ دعا کر رہا ہے کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ"۔ یہاں انسان کی احتیاج کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیوی زندگی کے مختلف معاملات میں جو نہایت پیچیدہ ہیں اور ان مسائل میں جو باہم گتھے ہوئے ہیں ایک اعتدال کی روش اور ایک متوازن طرز عمل کا محتاج ہے اور اس کی یہ احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی' اس لئے کہ تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان مسائل و معاملات کی پیچیدگیاں بھی مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہیں اور حیاتِ انسانی کی یہ پیچیدگیاں اور ان کے گوناگوں تقاضے اور مطالبے اور ان کا آپس میں ٹکراؤ اور تصادم' یہ عقدہ ہائے لاینحل ہیں اور کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مجرد اپنی عقل اور تجربے کی بنیاد پر ان جملہ سماجی و معاشرتی اور سیاسی و معاشی مسائل کا متوازن و معتدل اور عادلانہ و منصفانہ حل تلاش کر سکے اور حیاتِ اخروی میں بھی نجات اور فوز و فلاح حاصل کر سکے' جس پر چل وہ حیاتِ دنیوی کی برکتوں اور سعادتوں سے بھی پر سکون طور پر ہمکنار ہو سکے۔ یہ ہے درحقیقت انسان کی اہم ضرورت جس کے لئے سلسلۂ نبوت و رسالت اور انزالِ وحی و کتب کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک ایمان کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے انسان اپنی عقل اور فطرت سے بھی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے' جیسا کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ذریعے یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ انسان اپنی فطرتِ صحیحہ اور عقل سلیم کی

رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے' لیکن زندگی کی پر پیچ وادیوں میں سیدھی راہ کی تلاش' یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لئے وہ مجبور ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اپنے مالک سے ہدایت کی درخواست کرے' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہی واحد ممکن راستہ ہے۔

اس بات کو انسانی تمدن کے چند پیچیدہ مسائل کی مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اولین اور قدیم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے مابین حقوق اور فرائض کا صحیح توازن کیا ہے۔ ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ اس معاملے میں تاریخ انسانی میں شدید افراط و تفریط نظر آتی ہے۔ کسی معاشرے میں عورت بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک مملوک کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت قلوپطرہ بن کر کسی ملک کی تقدیر کا فیصلہ کر رہی ہے اور اس کے لئے تباہی اور بربادی کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ مرد و عورت کے درمیان توازن و اعتدال اور عدل و انصاف عقل انسانی کے بس میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان لازماً مرد ہو گا یا عورت' اور ان میں سے ہر ایک صرف اپنی ہی مصلحتوں اور مفادات کو مد نظر رکھنے پر مجبور ہے۔ گویا یہاں انسان اس فاطرِ فطرت کی رہنمائی کا محتاج ہے جس نے مرد کی تخلیق بھی کی ہے اور عورت کی بھی۔ جو دونوں کے عواطف اور میلانات کو بہ تمام و کمال جاننے والا ہے' جو تہذیب و تمدن میں دونوں کے حقوق و فرائض کا ایسا صحیح صحیح تعین کر سکتا ہے جس کی بدولت انسانی تمدن کی گاڑی دونوں پہیوں پر ہمواری کے ساتھ سیدھی راہ پر آگے بڑھ سکے۔

دوسری مثال فرد اور اجتماعیت کے باہمی تعلق و توازن سے متعلق ہے۔ اگر افراد کی انفرادی آزادی پر حدِ اعتدال سے زیادہ زور ہوتا ہے اور ان کے حقوق کا ضرورت سے زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے تو پلڑا ایک جانب جھک جاتا ہے اور مادر پدر آزادی انتشار اور انارکی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعیت اس طور پر مسلط ہو جاتی ہے کہ اس کے نیچے فرد سسکنے لگتا ہے اور اس کے حقوق بالکل پامال ہو جاتے ہیں۔ اس کی آزادی اور حریت کو اجتماعیت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین توازن قائم رکھنا نہایت کٹھن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی اس کی صلاحیت نہیں

رکھتی کہ وہ ایسے صحیح نقطۂ عدل کا تعین کر سکے کہ فرد کے حقوق بھی برقرار رہیں' اس کی انفرادی شخصیت کے صحت مند ارتقاء کے امکانات بھی روشن رہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرد معاشرے کے لئے ایک مضر اور نقصان دہ عنصر کی حیثیت اختیار نہ کر سکے' بلکہ ان دونوں کے مابین ایک مبنی بر عدل اور کامل توازن والا نظام قائم ہو سکے۔ عمرانیات کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی اس سے واقف ہیں کہ انسانی عقل اور تجربات تاحال ایسا نظام قائم کرنے سے یکسر قاصر رہے ہیں اور ان کے تجویز کردہ نظام لازماً افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں۔

یہی معاملہ معاشی مسائل کا بھی ہے جنہوں نے خاص طور پر صنعتی انقلاب کے بعد ایک نہایت گھمبیر اور لاینحل عقدے کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین صحیح توازن کیسے قائم کیا جائے اور اقتصادی معاملات میں عدل و اعتدال کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں۔ اس معاملے میں نقطۂ عدل و قسط کی تلاش میں نوع انسانی کتنی سرگرداں ہے اور کیسے کیسے تجربے کر رہی ہے' وہ روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ کہیں وہ انفرادی ملکیت کی نفی کلی کا تجربہ کرتی ہے جس سے انسان کی شخصی آزادی اور اس کی آزاد شخصیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سرمایہ ایک بہت بڑے ڈکٹیٹر کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور ایک سرمایہ دارانہ آمریت معاشرے پر مسلط ہو جاتی ہے جس میں امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور کسانوں اور مزدوروں کے لئے ایک باعزت اور آسودہ زندگی بسر کرنا محال ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ تین پیچیدہ امہات المسائل جن کے گوناگوں شعبوں اور پیچ در پیچ شاخوں اور پھر ان کے متضاد تقاضوں کو ایک متوازن و معتدل نظام میں سمونے سے انسان قاصر ہے۔ اس لئے کہ ان کے حل کے لئے جب بھی انسان سوچے گا' اپنے قریبی ظروف و احوال میں رہ کر سوچے گا' اور ان کا حل تلاش کرنے میں وہ اپنی ذات' گروہ یا طبقے سے بلند تر ہو کر معتدل اور منصفانہ راہ تلاش نہ کرپائے گا اور اس کی سوچ میں کہیں نہ کہیں کجی رہ جائے گی۔ اس کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ صراط مستقیم اور سَوَاءَ السَّبِیل سے بھٹک جائے گا۔ قرآن مجید اس معتدل اور متوازن راستے کو مختلف ناموں

سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے یعنی سیدھا راستہ۔ کہیں اسے سَواء السَّبیل کہا گیا ہے' کہیں صِراط السَّوِیّ یعنی برابری کا راستہ' جیسے خط استوا ہے جو ہمارے کرۂ ارضی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پس سَواء السَّبیل وہ راستہ ہو گا جس میں کامل توازن ہو' افراط و تفریط نہ ہو' کسی ایک جانب جھکاؤ نہ ہو جائے۔ کہیں اسے قَصدُ السَّبیل سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی معتدل اور درمیانی راستہ جس میں نہ ایچ پیچ ہو نہ اونچ نیچ' کہیں اسے سبیل السَّلام کہا گیا ہے یعنی سلامتی کا راستہ جس میں امن و سکون ہو' ظلم و عدوان نہ ہو' تعدی و استحصال نہ ہو۔

یہ ہے درحقیقت انسان کی وہ احتیاج جس کے لئے وہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے سامنے استدعا کرنے پر مجبور ہے کہ اے میرے رب! میں نے تجھے پہچان لیا' تیری توحید کو جان لیا' ادنیٰ درجہ ہی میں سہی لیکن مجھے تیری صفاتِ کمال کی معرفت بھی حاصل ہو گئی۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ مجھے مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ اس دن کامل اختیار صرف تیرے ہاتھ میں ہو گا۔ میں نے یہ ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ میں تیری ہی بندگی اور پرستش کروں گا اور اس کے لئے میں تیری ہی اعانت و امداد کا محتاج ہوں۔ للذا اب میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ زندگی بسر کرنے کا صراطِ مستقیم' سواء السّبیل اور سبیل السلام مجھ پر واضح فرما دے۔ مجھے اس کی ہدایت عطا فرما' اس کے لئے میرے دل کو اطمینان و انشراح بخش۔ مجھے اس پر چلنے کی توفیق دے۔ اس پر چلاتے ہوئے مجھے میری کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کی آخری منزل تک پہنچا دے۔ واضح رہے کہ یہی ایمان بالرسالت کی عقلی بنیاد ہے کیونکہ اس ہدایتِ ربانی کو انسانوں تک پہنچانے کے منصبِ جلیل پر رسولوں کی مقدس جماعت فائز ہوتی رہی ہے اور اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہیں' خاتم النبیّین' سید المرسلین' ہادیٔ آخر الزمان جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز کی اہمیت و وقعت زیادہ ہوتی ہے اسے مزید واضح کیا جاتا ہے' چنانچہ انسان کے دل میں جس چیز کی محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ للذا اس صراط مستقیم کی اہمیت پر زور دینے کے لئے اس کی مزید وضاحت خود اس کی

زبان سے کرائی جارہی ہے کہ :

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَO صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾

"(اے رب) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما' ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا"

یہ لوگ کون ہیں؟ اس سورۂ مبارکہ میں غایتِ اجمال و اختصار ہے۔ اس لئے یہاں ساری تفاصیل ممکن نہیں تھیں۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر کا یہ اصول پیش نظر رکھئے کہ "القرآنُ یفسِّر بعضُہ بعضًا" یعنی "قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے"۔ اس کے مطابق اگر تلاش کیا جائے کہ "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی تفسیر قرآن مجید میں کہاں وارد ہوئی ہے تو سورۂ نساء کی یہ آیت سامنے آئے گی :

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًاO ﴾ (آیت : ۶۹)

"اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول اطاعت پر کاربند ہو جائیں گے ان کو معیت اور رفاقت نصیب ہوگی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیائے کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور بہت ہی اچھے ہیں یہ رفیق (جو کسی کو میسر آجائیں)"۔

یہ چار گروہ ہیں مُنعَم علیہم کے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام و فضل ہوا' یہ ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ان میں انبیائے علیہم السلام سب سے بلند اور سب سے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔ ان کے بعد درجہ ہے حضراتِ صِدّیقین کا۔ ان کے بعد تیسرے نمبر پر آتے ہیں شہدائے کرام' پھر چوتھے نمبر پر عام مومنین صالحین ہیں۔ اس موقع پر نوکِ قلم پر دعا آ رہی ہے کہ اے رب ہمارے! ہمیں ان مُنعَم علیہم کے راستے کی ہدایت بخش' ہمیں ان کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے اور ہمیں ان کی رفاقت نصیب فرما!

صراطِ مستقیم کی اس مثبت انداز میں وضاحت کے بعد ایک سلبی اور منفی انداز میں بھی وضاحت کی گئی :

﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَO ﴾

"جو نہ مغضوب علیہم میں شامل ہیں اور نہ ہی گم کردہ راہ ہیں"۔

درحقیقت یہ دو کیفیات یا دو درجات ہیں جنہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا۔ ایک درجہ مغضوب علیہم کا ہے جو بہت ہی ناپسندیدہ ہے اور گویا ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيدًا کا مصداق ہے۔ جب کوئی فرد یا قوم یا امت ہدایت کی راہ کو اپنے نفس کی شرارتوں کے باعث اور اپنی خواہشات و شہوات کا اتباع کرتے ہوئے جان بوجھ کر چھوڑ دے' صداقت و ہدایت کی راہ سے جان بوجھ کر اعراض کرے' اس سے منہ موڑے تو ان کو قرآن "مغضوب علیہم" قرار دیتا ہے۔ یعنی جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ گویا جو لوگ حق کو حق اور باطل کو باطل جان کر بھی اپنے تعصبات کی وجہ سے یا اپنی خواہشات کی وجہ سے یا اپنے تکبر اور حسد کی بنیاد پر حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتے ہیں تو وہ مغضوب علیہم ہیں۔

ایک دوسرا گروہ ان کا ہے جو مغالطوں میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے' جیسے ہم "نیکی کی حقیقت" کی بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان غلط راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کا کوئی اچھا جذبہ غیر معتدل ہو کر کسی غلط صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے : ضَالِّيْنَ وہ لوگ جو بھٹک گئے' گم کردہ راہ ہیں' وہ قافلہ جو اپنا صحیح راستہ بھول کر کسی دوسری جانب نکل گیا ...... لفظ "ضال" کا ایک دوسری صورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے کہ جو شخص ابھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہو' اس کے اندر طلبِ ہدایت موجود ہو' لیکن ابھی وہ غور و فکر کے مراحل طے کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۃ الضحیٰ میں یہی لفظ استعمال کیا گیا : "وَوَجَدَكَ ضَالاًّ فَهَدٰى○" یعنی "(اے نبیؐ!) آپؐ کو پایا آپ کے رب نے تلاش حقیقت میں سرگرداں تو آپ پر ہدایت کا راستہ کھول دیا۔" آپؐ میں تلاش حقیقت کا جذبہ اس شدت کے ساتھ ابھرا کہ آپؐ نے غار حرا کی خلوت گزینی غور و فکر اور سوچ بچار میں کلی انہماک کے لئے اختیار فرمائی' لہٰذا پروردگار کی جانب سے پردے اٹھا دیئے گئے اور وحی کا آغاز ہو گیا۔

الغرض ضالین کا لفظ مغضوب علیہم کی بہ نسبت بہت ہلکا ہے۔ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے شرارت نفس کے طفیل محض اپنی خواہشات و شہوات کے اتباع میں حق کو

جان بوجھ کر ترک کر دیا اور ضالین وہ ہیں جو یا تو کسی مغالطے کے باعث راہ حق سے بھٹک گئے یا ابھی تلاش حق میں سرگرداں ہیں۔ مفسرین کے نزدیک مغضوب علیہم کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں' جنہوں نے جو ٹھوکریں کھائیں وہ کسی اندھیرے کے باعث نہیں کھائیں بلکہ اس وقت کھائیں جب سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ان کے پاس اللہ کا کلام موجود تھا' اللہ کی ہدایت موجود تھی' اللہ کی شریعت موجود تھی' لیکن اپنی شرارتِ نفس کے باعث انہوں نے اس میں تحریفات کیں۔ اس کے بجائے کہ اپنے آپ کو اللہ کی منشاء کے مطابق ڈھال لیتے انہوں نے اللہ کے کلام اور اس کے قانون کو اپنی خواہشات کے رخ پر ڈھال لیا۔ یعنی وہی رویّہ ہے جو علامہ اقبال کے بقول ہمارے علمائے سُوء نے اختیار کیا کہ ؎

خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیّین 'امتِ مسلمہ کے آخرالامم اور قرآن کے ع "نوعِ انساں را پیامِ آخریں!" کے مصداق آخری کتاب ہونے کی برکت سے قرآن کا متن محفوظ و مصئون رہا اور تحریف جو بھی ہوئی صرف ترجمہ اور تفسیر میں ہوئی جبکہ سابقہ امتیں' بالخصوص یہود اس معاملے میں بہت دور نکل گئے تھے اور ان کے علماء نے تو اللہ کی کتاب میں لفظی تحریف تک کر دی تھی۔ لہٰذا یہ "مغضوب علیھم" کے زمرے میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے۔ : "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ" یعنی "ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔" اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے حامل ہونے کے باوجود اپنی شراتِ نفس کے باعث اس ہدایت سے روگردانی کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

سابقہ امم میں سے "ضالین" کی نمایاں مثال نصاریٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ہیں۔ اس لئے کہ محبت اور عقیدت کے غلو میں انہوں نے حضرت مسیحؑ کا مقام اتنا بڑھایا کہ معاذاللہ انہیں اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ ساتھ ہی عملی طور پر انہوں نے رہبانیت کی

بدعت اختیار کی جس کے متعلق سورۂ حدید میں ارشاد ہوا : "وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ" یعنی "رہبانیت کی بدعت خود انہوں نے اختیار کی' ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا"۔ یہ درحقیقت ایک خلافِ فطرت نظام تھا جو انہوں نے خود اپنی مرضی سے اپنی نیکی کے جذبے میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے اوپر غیر فطری پابندیاں عائد کرتے ہوئے اختیار کر لیا تھا۔ ان میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے باہمت نکلے جو ان پابندیوں کو نباہ گئے لیکن ان کی اکثریت ان پابندیوں کو نباہ نہ سکی۔ نتیجتاً جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ ہوا اور راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان آباد ہو گئے۔ یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے فطرت کے خلاف کام کیا۔ چنانچہ مفسرین کی اکثریت کے نزدیک سورۂ فاتحہ میں "مغضوب علیہم" سے مراد یہود اور "ضالین" سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ویسے اس مفہوم کو عام رکھا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی دو نمایاں مثالوں سے یہ بات صد فیصد درست ہے۔

بہر حال یہ ہے سورۂ فاتحہ کا وہ تیسرا حصہ جس کے بارے میں اس حدیثِ قدسی میں جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں : "هٰذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ" یعنی "یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے دیا اپنے بندے کو جو اس نے طلب کیا"۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث قدسی اس سورۂ مبارکہ کے تجزیہ میں بھی بہت مفید ہے اور اس کی عظمت کو بھی بتمام و کمال اور بحسن و خوبی ظاہر کر رہی ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کی وہ ترجمانی ہے کہ اگر واقعتاً یہ الفاظ کسی شخص کی زبان سے گہرے شعور و احساس اور قلب و ذہن کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں تو ان کی تاثیر وہی ہے جو اس حدیث قدسی میں وارد ہوئی کہ اِدھر بندہ ایک ایک جملہ کہتا ہے اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ملتا چلا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر' اٹھتے ہیں حجاب آخر

سورۂ فاتحہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم کا ایک نہایت خوبصورت اور انتہائی موزوں مقدمہ اور دیباچہ ہے۔ فطرت انسانی کی وہ پیاس

اور صراطِ مستقیم کی وہ احتیاج جس کی ترجمانی سورۂ فاتحہ میں کی گئی ہے اسی کی جانب رہنمائی کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے فوراً بعد وارد ہوتے ہیں یہ الفاظِ مبارکہ "الٓمّٓ ○ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ ' ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ○ "یعنی یہ ہے وہ کتاب جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ کسی فلسفی کے من گھڑت خیالات و نظریات اور ذہن انسانی کی تگ و تاز پر مبنی نہیں ہے۔ یہ "الحق" یعنی سراسر حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہے جن میں سیدھے راستے کی طلب اور پیاس موجود ہے۔ گویا یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پورے قرآن مجید کے ساتھ تعلق۔ مزید برآں مباحثِ ایمان کے ذیل میں اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی عقل اور فطرت کی رہنمائی میں کہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی ہے وہ بات جسے علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں

عقل یقیناً آستان سے دور نہیں ہے 'اس کی رہنمائی میں انسان بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں وہ محتاج ہے وہ درحقیقت وہ ہدایت و رہنمائی ہے جو اسے اپنی زندگی کے گوناگوں اور مختلف پہلوؤں میں ہر ہر لحظہ اور ہر ہر قدم پر عمل کے لئے درکار ہے۔ اس کے لئے وہ ہدایتِ آسمانی کا بالکلیہ محتاج ہے۔ اسی لئے اس کی فطرت پکارتی ہے اور استدعا کرتی ہے : اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ اس فطرت کی پکار کا جواب ہے پورا قرآن مجید۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے اور اس پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَآخِرُ دَعوانا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن ○